© rasailojaraid.com

شاہ ولی اللہ دہلویؒ

ترجمہ: سیّد ابوالخیر مودودیؒ

اصولِ ترجمۂ قرآن

اللہ کریم کی رحمت کا محتاج ولی اللہ بن عبدالرحیم کہتا ہے:

قرآن کریم کے ترجمے کے اصول وقواعد میں یہ ایک رسالہ ہے، جس کا نام "المقدمہ فی قوانین الترجمہ" ہے۔ یہ اس وقت ضبطِ قلم میں آیا، جب میں ترجمۂ قرآن حکیم کا مسودہ کررہا تھا۔ واللہ الہادی الی الحق!

ترجمہ نویسی میں مترجمین مختلف طریقوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ بعض کا طریقہ یہ ہے کہ وہ جدا جدا ہر کلمے کا ترجمہ کرتے جاتے اور آخر مضمون تک اسی کے پابند رہتے ہیں کہ ہر کلمے کا ترجمہ تحت اللفظ ہے۔ اور اس کو "لفظی ترجمہ" کہتے ہیں۔ مترجمین کی دوسری جماعت پسندیدۂ اسلاف ہے کہ وہ اوّل پورے کلام میں غور وتامل سے کام لیتے، مجاز وکنایہ میں تقدیم وتاخیر کی معرفت چاہتے اور اس ترتیب کے ساتھ عبارت کے معنی کو ذہن نشین کرتے ہیں۔ بعد ازاں اپنی صوابدید پر ان معانی کو موزوں اور مناسب الفاظ اور بندش کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ اور اس ترجمے کو "بیان حاصل معنیٰ" (معنوی ترجمہ) کہا جاتا ہے۔

ترجمے کا طریق اوّل نقص وخلل سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کہ لفظی ترجمے میں اکثر وبیشتر ترجمے کا نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ اصل مضمون میں ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ جس زبان میں ترجمہ کیا جارہا ہے، اس کا لغت میں اس ترکیب کا ترجمہ صحیح طور پر ناممکن ہوتا ہے۔ اور کم از کم کلام میں رکاکت، تعقید (گنجلک) اور اسی قسم کے چھوٹے چھوٹے ارتکابات تو ضرور ہی پیش آجاتے ہیں۔ اور اس صورتِ حال کی وجہ یہ ہے کہ مختلف زبانوں میں بعض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اجزائے کلام کی بعض پر تقدیم کا اسلوب قطعاً الگ الگ ہے۔ اور کلمات کی ترکیب، کنایات کے استعمال اور صلات کے اطلاق میں بھی جدا جدا نہج پائے جاتے ہیں۔ نیز بعض زبانوں میں لازم سے ملزوم کی جانب، یا ملزوم سے لازم کی جانب منتقل ہوتا، اور ایک خاص لفظ کا دوسرے خاص لفظ کو استعارہ کرنا صحیح نہیں ہوتا۔ اور دوسری زبان میں اصل وحقیقت کے لحاظ سے وہی لفظ (اس جگہ) درست نہیں بیٹھتا۔ مثلاً عربی زبان میں کہتے ہیں کہ فلاں شخص ''عظیم الرماد'' (بہت راکھ رکھنے والا) ہے اور یہ کہ اس شخص کی سخاوت مراد لیتے ہیں اور اس مفہوم میں منتقل کر لیتے ہیں۔ پس اگر فارسی زبان داں اس کا ترجمہ ''بزرگِ خاکستر'' کر کے معنی ''سخاوت'' کو ادا کرنا چاہیں تو یہ قطعاً نادرست ہوگا۔ اسی طرح عربی زبان میں ایک ہی لغت کے لیے ایسی ایسی خصوصیات ملحوظ ہوتی ہیں، جن کا فارسی زبان میں فقدان ہے۔ مثلاً حیوانات کی آوازوں کے لیے عربی زبان میں یہ امتیازات ہیں: **رعاء الابل** (اونٹ کا بلبلانا)، **خوار البقر** (گائے بیل کا رینکنا) **صهال الفرس** (گھوڑے کا ہنہنانا)، **ثواج التیس** (مینڈھے کا بولنا)، **یعار المعتر** (بکری کا میں میں کرنا)، **نهق الحمار** (گدھے کا ہینچنا)، **نباح الکلب** (کتے کا بھونکنا)، **هدیر الحمام** (کبوتر کا غٹرغوں کرنا) اور اسی طرح **جود الکلب** (کتے کا پلّا)، **مثیل الاسد** (شیر کا بچہ)، **فصیل الابل** (اونٹ کا بچہ)، **جدی البقر** (گائے کا بچھڑا)، **عناق الشاة** (بکری کا بچہ)۔

فارسی لغات میں چوں کہ ان خصوصیات و امتیازات کے لیے علیحدہ علیحدہ لغات مستعمل نہیں ہیں۔ اسی لیے ان عربی لغات کے ترجمے میں جدا جدا خصوصی اور امتیازی لغت بے تکلف حاصل نہیں ہو سکتے۔ پھر ان اختلافات کے علاوہ اصل افعال میں بھی بہت اختلافات موجود ہیں۔ غرض اس قسم کے اختلافات ہیں جو مختلف زبانوں اور لغتوں میں پائے جاتے ہیں۔ اور ایک عاقل و ذہین انسان پر یہ حقیقت بخوبی روشن ہے۔

دوسرا طریقہ بھی خلل وفساد سے خالی نہیں ہے۔ اس لیے کہ اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ کلام میں دو مستقل وجوہ کی گنجائش ہے اور مترجم اس درجہ حاذق اور ماہر نہیں ہے کہ ان ہر دو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وجوہ میں سے متکلم کی مدد کو پا سکے۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ مترجم مرادِ متکلم کے خلاف ترجمہ کر دے گا۔ اور اگر حقیقتِ امر پوچھتے ہو، تو کتبِ سابقہ میں تحریف نے اکثر اسی سبب سے راہ پائی ہے۔

پس کلامِ الٰہی کے ترجمے میں یہ ازبس ضروری ہے کہ کتاب الٰہی کا نظم بحالہ باقی رہے (یعنی کلام الٰہی کے ترجمے میں یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ ترجمے کے ساتھ ساتھ اصل کلام الٰہی کا مکتوب ہونا فرض و لازم ہے، تاکہ تحریف سے محفوظ رہے۔) اس کا یہ بھی فائدہ ہے کہ اگر اصل ''نظمِ کلام'' باقی ہے اور مترجم سے بعض مواقع میں لغزش ہو گئی ہے، تو دوسرا شخص بفحوائے حدیث: فرب مبلغ اوعیٰ له من سامع (پس بسا وہ شخص، جس تک بات پہنچائی گئی ہے، براہ راست سننے والے کے مقابلے میں اس بات کو محفوظ رکھنے اور اس کی تہہ تک پہنچنے میں زیادہ محافظ مآب ہوتا ہے۔)، اس غلطی کا تدارک کر سکتا ہے۔

پھر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مشکل مواقع اور ابہامات و مجملات کے منشاء کی توجیہہ اور اس قسم کے دوسرے امور میں علمائے اسلام مختلف مسلک رکھتے ہیں۔ اور اگر بنظرِ تحقیق دیکھا جائے، تو علماء کے یہ تمام مسلک ''اصل شرع'' نہیں ہیں، بلکہ عقل و خرد کی استعانت سے شرع کے مسائل میں ایک قسم کی موشگافی ہے۔ پس اگر ایک عالم اپنے فہم و تدبر کے مطابق توجیہہ بیان کرے، اور اصل نظم کلامِ الٰہی باقی نہ رہے، تو اصل شرع میں کمی آتی چلی جائے گی۔

نیز جب کہ قرآن عظیم لغتِ عرب پر نازل ہوا ہے، اور آنحضرت ﷺ نے بھی لغتِ عرب ہی میں گفتگو فرمائی ہے، پھر امتِ مرحومہ کا معاملہ (دینی و دنیوی) لغتِ عرب کی معرفت کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ اس لیے امتِ مرحومہ پر لغتِ عرب کی معرفت واجب بالکفایہ ہوتی، اور ہر فردِ مسلم کے لیے اس کی معرفت مسنون و مستحب قرار پائی۔

جو شخص لغتِ عرب سے نا آشنا ہے، دینِ محمد ﷺ کی معرفت کے پیشِ نظر اس شخص کا شمار زندہ انسانوں میں بلکہ انسانوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو جمادات کی طرح سمجھا جاتا اور اس کا مردوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس نے خود پر اس عجز کو لازم کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو رحمت سے محروم رکھا، اور اپنے لیے اپنی خواہشِ نفس سے یہ تجویز کر لیا ہے کہ شرع نے اس کو سربلندی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہ بخشی۔

بہر حال لغتِ عرب کی معرفت کا لزوم ہی اس حقیقت کا سبب بنا کہ تلاوتِ قرآن عظیم، ذکر خدائے برتر، اور خطبہ عید و جمعہ میں لغتِ فارسی کو جائز نہیں رکھتے۔ اگر چہ ان امور کا مقصد تحصیلِ عبرت و بصیرت اور پند و نصیحت ہے، خصوصیتِ الفاظ نہیں ہے۔ پس قرآن عظیم کے ترجمے کا اہم مقصد یہ ٹھہرا کہ پڑھنے والے کو نظمِ قرآن کی معرفت میں ''ندرت'' اور کلام اللہ کی عبارت میں غور و خوض سے ملکہ حاصل ہو، تا کہ اس کی بدولت وہ قرآن عظیم کے فوائدِ عالیہ تک پہنچ سکے۔ اور یہ معنی ترجمہ کے اس دوسرے طریق بیان حاصل معنی میں مفقود ہیں۔

پھر ایک جماعت نے ان دونوں راہوں سے جدا ایک تیسری راہ اختیار کر لی۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ مسطورہ بالا دونوں اسالیب میں خلل اور نقص پایا جاتا ہے تو ان دونوں کو ملا دیا، تا کہ ایک سے دوسری وجہ کا جبر نقصان ہو کر مطلب و مقصد حاصل ہو سکے۔ چنانچہ اُنھوں نے لفظی ترجمہ اور بیانِ حصول معنی دونوں کو اپنا لیا، تا کہ جس وقت تحت الفظ ترجمہ کی وجہ سے تعقید (گنجلک) اور رکاکت پیدا ہو جائے، تو دوسرے طریق، یعنی مفہوم و مراد کے بیان و تقریر کے ذریعے اس کا تدراک کر دیا جائے۔ اور اگر جملے اور عبارت میں موجود دو وجوہ میں سے کسی ایک وجہ کو یا متشابہ کی کسی خاص توجیہہ کو اختیار کر کے مفہوم و مراد بیان کرنے میں خلل اور فساد پیدا ہو جائے تو اس کا علاج تحت اللفظ ترجمے سے کر دیا جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسرا طریقہ بھی اصحابِ ذوقِ سلیم کے مذاق کے قطعاً خلاف اور معیوب ہے۔ اور یہ طریقہ مبتدی کے لیے تشویش کا باعث، اور منتہیٰ کے لیے بے کار اور غیر مفید، نیز تطویل اور طائل کا موجب ہے اور اس طرح کلام اپنے نسق سے خارج ہو جاتا ہے۔

اور اگر اس طریقے کے اختیار کرنے کی حقیقت تک رسائی مقصود ہے، تو صاف بات یہ ہے کہ اس طریقِ کار کے اختیار کرنے کا مقصد ہر دو لغات و زبان کے رسم کلام سے درماندگی اور جہل میں (یعنی وہ ترجمے کی زبان اور عربی زبان دونوں کے رسم کلام اور فرقِ لغات کے فہم سے عاجز و درماندہ ہونے کی وجہ سے یہ طویل راہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

غرض ترجمے کے لیے یہ تینوں ترجمے خلل وفساد اور نقص وعیب سے خالی نہیں ہیں۔

یہ فقیر جب ان ہرسہ طریق پر مطلع ہوا، اور ان میں جو خلل وفساد پایا جاتا ہے، اس کو دیکھا، تو جی چاہا کہ ان راہوں سے جدا ایک چوتھی راہ ایسی پیدا کی جائے، جس میں مسطورہ بالا ہرسہ طریق کے فوائد جامع ہوں۔ اور ان میں جو خلل وفساد کی صورتیں ہیں، ان سے محفوظ ہو۔ چنانچہ میں نے ایک ہاتھ میں تو لفظی ترجمہ لیا، اور ساتھ ہی اس مفاسد کو بھی پیشِ نظر رکھا اور اس سلسلے میں مختلف طریقہ ہائے تصرف کو زیرِ نظر لایا، اور بیان حاصل معنی کو دوسرے ہاتھ لیا۔ اور فہم مراد کے مشکل موقعوں کو اور بسہولت ان سے رست گاری کے طریقوں کو منضبط کیا، اور یہ سب کچھ پیشِ نظر رکھنے کے بعد ترجمے کی داغ بیل اس طرح ڈالی کہ اوّل اس طرح لفظی ترجمہ کیا کہ نظمِ قرآنی کے ساتھ پوری طرح مطابقت قائم رہے۔ اور ساتھ ہی لحاظ رکھا کہ افعال کے صلات کا جو اختلاف ہے، اس کو اپنی فہم سے درست کیا جائے۔ اور جس جس مقام پر فارسی کے ترجمۂ لفظی میں رکاکت اور تعقید لازم آ گئی، یا لغتِ عربی میں ایسی ترکیب واقع ہوئی کہ اس کی نظیر لغتِ فارسی میں نہیں پائی جاتی تو ان مواقع میں عربی زبان ہی سے ایسے مترادف الفاظ وکلمات کے ذریعے ترجمہ کر دیا، جو اصل کی قائم مقامی کر سکیں۔ مثلاً اسم فاعل استقبال کے لیے آتا ہے تو فعل مستقبل معلوم اس کا مساوی ہوتا ہے۔ نیز اسم مفعول جو استقبال کے بعد لایا جاتا ہے، تو اس کا مساوی فعل مستقبل مجہول ہوتا ہے جیسا کہ **قل یا ایھا المومنون، یاھؤلاء المومنین** بلحاظ معنی ایک حال میں ہیں، یعنی اے ایمان والو! یا اے وہ لوگو، جو ایمان لائے! دونوں جملے ہم معنی ہیں اور اسی طرح...... **فمالھم من ناصرین** اور **فما لھم من ناصر** دونوں کا ایک ہی نسق ہے۔ اس لیے کہ اس جگہ ناصرین سے جمع مراد نہیں بلکہ افراد مراد ہیں (پس ناصر اور ناصرین ہم معنی ہیں)۔

یہی وجہ ہے کہ ہمارے دین حقہ میں اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ ہم سات حروف (لغاتِ عرب) میں سے جس حرف (لغت) میں چاہیں قرآن حکیم کی قرأت کر سکتے ہیں۔ اسی بنا پر صحابہ رضی اللہ عنہم نے تفسیر لفظی موافق لغت کے ساتھ جائز رکھی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں نے ترجمۂ قرآن حکیم میں اس بات کو بھی ملحوظِ خاطر رکھا ہے کہ جس لفظ یا جملہ کا حق مقدم یا موخر ہونے کا ہے، وہ مقدم و موخر ہی رہے، اور یہ کہ مقدرات کو ظاہر کر دیا جائے، اور ترخیم کا ترک اور تبیین (اظہار) جیسے نحوی مسائل کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ اور اگر فہم مراد میں مشکل پیش آ گئی تو حتیٰ الامکان یہ قصد و ارادہ کیا کہ تقدیم و تاخیر اور مقدرات کے اظہار میں ایک لفظ کا اضافہ یا معطوف پر عامل کا اعادہ، یا مضمر کا اظہار، یا مظہر کا اضمار اس قسم کے ادنیٰ تصرف کے ذریعے سے اس صعوبت کو حل کر دیا جائے اور اگر کلام کا مزاج اس قسم کے تصرف سے ابا (انکار) کرتا ہے تو لفظی ترجمے کے بعد حاصل معنی کو لفظ: یا مراد آنست (یا یہ مراد ہے) کا نشان دے کر ذکر کر دیا جائے۔ اور اگر کسی لفظی قید کا ذکر، کسی کلام مجمل کی تفصیل، کسی کنایہ کا حل، کسی لفظ کے معرفہ ہونے کا کشف، یا کسی مبہم کا ازالۂ ابہام ضروری معلوم ہوا تو ان کو بھی ''یا مراد آنست'' کہہ کر بیان کر دیا ہے۔ اس لیے سعادت مند صاحب مطالعہ کے لیے از بس ضروری ہے کہ ترجمہ کے جب اس مقام پر پہنچے جہاں لفظ ''یعنی'' مذکور ہیں، تو کلمۂ سابق کا اعادہ کر کے اصل کلام کے ساتھ اس کو مربوط کرے (اور معنی کو شرح و وضاحت کی حیثیت میں مطالعہ کرے)۔

غرض عربی اور فارسی لغات کے مابین مواقع اختلاف اکثر و بیشتر ہیں۔ من جملہ ان کے ایک یہ ہیں کہ اہلِ عرب کا دستور ہے کہ اوّل کسی مطلب کو اجمال و اختصار کے ساتھ بیان کرتے اور اس کے بعد اس کی تفصیل و تبیین کی جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی نظر میں یہ تفصیل بعد از اجمال اس سے کم لذت اندوز نہیں ہیں کہ ابتداء ہی میں وہ تفصیل کے ساتھ کلام کو بیان کر دیں۔ مثلاً وہ کہا کرتے ہیں ضربت زیداً رأسه (میں نے زید کے سر پر مارا)، حَسُنَ زیداً داراً (زید کا گھر اچھا ہے)، ان احد استجارک (اور اگر کوئی تجھ سے پناہ چاہے)، پس ضربت زیداً رأسه اور سلبت زیداً ثوبه میں بعجلت اوّل زید پر حکم ثابت کرتے ہیں، اور درحقیقت مقصد یہ ہوتا ہے کہ زید کے متعلقات پر حکم صادر کریں۔ اس لیے اس تسامح کا تدارک کرنے کے لیے ہر اس متعلق کو بیان کرتے ہیں۔ اسی طرح حسنِ زید کا اوّل اثبات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتے ہیں، اور حقیقت میں حسنِ زید کا اثبات اس کے متعلق یعنی دارِ زید کے ذریعے مقصود ہوتا ہے، اس لیے پھر رجوع کرتے ہیں اور تمیز نحوی کی شکل میں اس کا تدارک کرتے ہیں (یعنی جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ زید کا گھر بہت خوبصورت ہے، تو اس کی تعبیر یوں کرتے ہیں، زید حسین ہے اپنے گھر کے اعتبار سے)۔ اور اس بنا پر (اہلِ لغت) یہ کہتے ہیں کہ تمیز از نسبت محول ہے، فاعل یا مفعول سے اور ان احد میں استجار کو مضمر اور پوشیدہ، اور ضربتُ زیداً میں ضربت کو مضمر تسلیم کرتے ہیں۔ اور بعد ازاں اضمار کی وجہ سے کلام میں جو خلل پیدا ہو جاتا ہے، اس کا تدارک اس طرح کرتے ہیں کہ کلام کے شروع میں اس مقدر کو ملحوظ مان لیتے ہیں اور ظاہر ہے کہ اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مانوس نہیں ہے۔

ازاں جملہ اہلِ عرب جب ایک جملہ بولنے کا ارادہ کرتے ہیں، تو اس میں ایک خاص قسم کا تغیر کرتے ہیں۔ اور جملے کو اس کے اصل مزاج سے ہٹا کر استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً **وعد الله** اور **سبح الله** اور **سقاک الله** (اور اللہ نے وعدہ کیا ہے، اللہ پاک ہے اور اللہ تجھ کو سیراب کرے!)۔ اس میں وہ تصرف کرتے ہیں اور فعل کی جگہ مصدر کو قائم مقام بنا دیتے ہیں۔ پھر اس کو فعل کے معمول کے ساتھ خواہ وہ فاعل ہو یا مفعول، بواسطہ حرفِ جر یا بلاواسطہ مضاف کر دیتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: **وعد الله حقا. سبحان الله، سقیالک**۔ مگر عجمی زبان اس قسم کے تصرف سے مطلق آشنا نہیں ہے۔ اور من جملہ دوسرے تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ لفظ منکر کو (نکرہ) معروف (معرفہ) کی صورت میں بولتے ہیں، کہ لفظ میں تخفیف حاصل ہو جائے۔ درآں حالے کہ ان تصرف کرنے والوں کی غرض ان تصرفات کے باوجود وہی معنی ہی ہوتے ہیں۔

اور من جملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ کبھی وہ یہ چاہتے ہیں کہ ایک مضمون کو دو مرتبہ پیشِ نظر لائیں، اور سہولت ادا بھی ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ پس یہ کرتے ہیں کہ اسی مکرر کو اوّل کے ساتھ متفق کر دیتے ہیں۔ مثلاً بعض کہتے ہیں **هو اعلمهم علما، واحلمهم حلما، و زید ابوک عطوفاً، وتبسم ضاحکاً، وقام قائماً، والذاريات ذروا،**

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والصافات صفًا۔ اس قسم کا تصرف عجمی زبان میں مستعمل نہیں۔

اور من جملہ تصرفات کے ایک تصرف یہ ہے کہ اہلِ عرب جملہ تامہ کا ارادہ کرتے ہیں، مگر اس کی صورت اس طرح بدل دیتے ہیں کہ کسی فعل یا حرف کو اجزاء جملہ پر مسلط کر دیتے ہیں، مثلاً کہتے ہیں: **ماکان زید لیفعل ھذا. وانما ضرب زید. وظننت زیداً قائما**۔ اس کے برعکس فارسی زبان میں اس قسم کے عامل کو، جو عربی زبان میں فعل یا وقت کی زبان میں نمودار ہوتا ہے، اجزائے جملے پر مسلط نہیں کرتے، بلکہ اس کو جدا لاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں: ''دانستم کہ زید قائم است'' اور یوں نہیں کہتے: ''دانستم زید را استادہ''

اور ازاں جملہ یہ کہ عربی میں قام زید کہتے ہیں اور فارسی میں زید استادہ کہتے ہیں۔ پس اگر قام زید کی طرح فارسی بھی ایستادہ زید کہے، تو یہ جملہ رکیک ہو جائے گا۔

اور ازاں جملہ یہ کہ فارسی میں حال ماضی کی اگر حکایت کریں، تو ماضی میں ''مے'' داخل کرنے سے معنی متحقق ہو جاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں ''می کرد''، ''می نہ زد''۔ مگر عربی زبان میں جب تک لفظ کان کو اپنے اصل حقیقت سے ہٹا کر مستعار نہ لیا جائے، حکایت حال ماضی کے معنی درست نہیں ہو سکتے۔ مثلاً یوں کہیں گے کہ کان یفعل۔

اسی طرح یہ کہ عربی میں فعل مضارع جعل اور کاد کی خبر واقع ہو سکتا ہے۔ برخلاف فارسی کے کہ اس میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہی عربی میں جملہ اسم کی خبر واقع ہوتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ زید قام ابوہ، اور یہ صورت فارسی میں تکلف کے بغیر درست نہیں ہوتی۔

الحاصل، دونوں زبانوں کے مواقع اختلاف بہت ہیں، اور اسی لیے مترجم مضطر (مجبور) ہو جاتا ہے کہ (ادائے مفہوم کے لیے) کسی حرف (لفظ) کو اپنی جانب سے پیش کرے۔ چنانچہ مشہور مقولہ ہے **الضرورات تبیح المحظورات** (یعنی) ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فعل

(یہ ترجمہ فارسی زبان میں ہے، اس لیے چند باتیں فارسی
ترکیبوں کے متعلق ہی گوش گزار کی جانی ضروری ہیں۔)

فارسی میں لفظ ''است'' ربط کی علامت ہے جو جملہ اسمیہ وظرفیہ کے ہر دو اطراف کے درمیان رابطہ کو ظاہر کرتا ہے، مثلاً زید قائم ست'' ''زید کجا ست''۔ درحقیقت یہ علامت ہے فاعل کی جانب انتسابِ فعل کی، اس شرط کے ساتھ کہ فاعل کو مقدم کرتے ہوئے، فعل کو اس کے متصل لاتے اور علامت ''است'' کو آخر میں بیان کرتے ہیں۔ گویا ''زید قائم است'' کی مثال میں ضرورت کے وقت ''است'' کو اسنادِ زید کہا جا سکتا ہے۔ اور ''مفعول'' قائم مقام فاعل کے ساتھ ہوتا، یا کسی حرف (علامت) کے ساتھ مقرون ہوتا ہے مثلاً ''زدم زید را'' یا ''زدہ شہ زید را'' اور تسامح کے طور پر اس دوسرے جملے کو یوں بھی ادا کر دیتے ہیں: ''زید زدہ شد'' اور اگر قرینہ موجود ہو تو (مفعول کا) حذف بھی درست ہے۔

اور مفعول مطلق اگر عدد کے لیے ہو تو یہ ظاہر کرنا چاہیے کہ ایک مرتبہ یا دو مرتبہ کیا مقصود ہے اور اگر اظہارِ نوع کے لیے ہو تو ''نوع'' اور ''طور'' کو بیان کرنا چاہیے۔ اور اگر غیر مصدر کو مصدر کی جگہ رکھیں، مثلاً ''ضربت سوطا'' تو اس طرح ترجمہ کریں گے، ''زدم یک چابک''۔

اور اگر مفعول، فعل کے لفظ سے جدا لفظ میں ادا کیا جائے، مثلاً ''قرأت سرداً'' تو یوں کہیں گے: ''خواندم بطریق پے در پے خواندان'' (میں نے مسلسل پڑھنے کے طریق پر پڑھا)۔

اور اگر صرف تاکید ہی کی غرض سے مفعول کو لایا جائے، یا مفعول کا ذکر اس طرح ہو، جیسا کہ (عربی زبان کے استعمالات میں) ''سبحان اللہ'' میں ہے، تو یہ دونوں لغات (عربی و فارسی) کے اختلاف کے قبیل سے ہے اور بغیر تکلف اور دوسرے حرف کے لوٹائے بغیر صحیح ترجمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حاصل نہیں ہوسکتا۔

اور اگر مفعول لہ ''غرض'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، تو لفظ ''برائے'' یا لفظ ''تا'' لاتے ہیں اور جملہ ضربتہ تادیبا میں ترجمہ فارسی کے اندر مصدر کی تصویر اس طرح کھینچی جاتی ہے ''زدمش برائے دادنِ ادب'' یا ''زدمش تا ادب دہم''۔

اور اگر مفعول لہ ''حاصل'' اور ''ثمرہ'' کے معنی میں مستعمل ہوا ہے، تو اس کے لیے فارسی ترجمہ میں لفظ ''بعلت''، ''بحکم''، ''بمقتضا'' جیسے الفاظ لانے ہوں گے۔ مثلاً قعد جبناً کا ترجمہ یہ ہوگا۔ ''نشست بعلت نامردی'' (یا بہ سبب نامردی)

اور اگر ''احتراز'' کے معنی میں استعمال کیا جائے، تو اس صورت میں لفظ ''احتراز'' یا ''برائے احتراز'' یا اسی قسم کے الفاظ لائے جائیں گے۔ مثلاً 'ضربتہ ان یقول الناس ما ضربتہ' کا ترجمہ یوں کریں گے ''زدمش برائے اجتناب ازاں کہ گویند نہ زدمش''۔

اور مفعول فیہ کا فارسی ترجمہ ظرف مکان وظرف زمان دونوں حالتوں میں لفظ ''در'' کے ساتھ کریں گے۔ اور مفعول معہ کو لفظ ''با'' کے ساتھ ظاہر کریں گے۔ مثلاً **استوی الماء والخشبة** کا ترجمہ ''برابر شد آب با چوپ'' ہوگا۔

اور حال اگر مفرد کلمہ ہو تو فارسی ترجمے میں ایک ایسے لفظ کا اشتقاق کرنا ہوگا جو حال کے معنی کے لیے وضع کیا گیا ہو۔ مثلاً ''جئت راکبا'' کا ترجمہ ''سوار آمدم'' ہوگا۔

اور اگر حال جملہ ہے، اور ذوالحال کے فعل وعمل پر مشتمل ہو، تب لفظ ''کردہ'' ''کناں'' جیسے الفاظ کو اختیار کرنا ہوگا۔ مثلاً ''**جاء زید یتبختر فی مشیه**'' کا فارسی ترجمہ ''زید آمد متبختر کناں در رفتار خود'' ہوگا۔

اور اگر جملہ ذوالحال کے فعل کے علاوہ فعل پر مشتمل ہو، تو لفظ ''حال آں کہ'' کے اضافے کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے۔ اگرچہ فارسی کے اصل لغت میں اس کا وجود نظر نہیں آتا۔ یہ بھی واضح رہے کہ ''حال'' عربی زبان میں ''شے'' کے معنی میں کہیں استعمال نہیں ہوا۔

حال کبھی تاکید کے معنی میں آتا ہے، مثلاً جاء نی ابوک عطوفاً (میرے پاس تیرے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

باپ کی آمد ہمدردانہ آمد ہے)۔ اور کبھی ''تھئی'' اور ''تیاری'' کے معنی میں جب کہ فادخلوھا خالدین (پس داخل ہو جاؤ، اس میں ہمیشہ رہنے کی تیاری کرتے رہو)۔ اور کبھی بمعنی قصد آتا ہے۔ مثلاً ''جئت اشکر اللہ'' (میں آیا کہ اللہ کی شکرگزاری کروں۔)

اور فارسی زبان میں یہ معانی مستعمل نہیں ہیں۔

اور تمیز، اگر عدد، وزن یا پیمانے یا مساحت سے ہو تو فارسی ترجمے میں یا تمیز کا صیغہ استعمال کریں گے، یا اس کو اضافت کے ذریعے ظاہر کریں گے۔ اور یا لفظ ''از'' سے اس کا اظہار ہوگا۔ مثلاً ''بست مرد''، ''یک رطل گندم''، ''یک صاع از جو''۔

اور اگر اسم اشارہ سے تمیز مقصود ہو، تو صفت کا لفظ ترجمہ فارسی میں اس کو ادا کرے گا۔ مثلاً ماذا اراد اللہ بھذا مثلاً کا ترجمہ یہ ہوگا: ''چہ چیز ارادہ کردہ است خدا ازیں مثال'' (یعنی ایسی مثال بیان کرنے سے خدا نے کیا ارادہ کیا ہے۔)

اور اگر نسبت سے تمیز مطلوب ہے، تو اس صورت میں اس کو فاعل یا مفعول میں منتقل کریں گے۔ اور یا لفظ ''از روئے''، ''از جہت''، ''باعتبار'' اضافہ کر کے معنی بیان کریں گے، مثلاً زید حسن داراً کا ترجمہ ہوگا: ''زید خوب است از روئے خانہ'' یا ''زید نیک است باعتبارِ خانہ''۔

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ دوسری زبان کا مضمون فارسی زبان میں اس تصرف کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ دو کلمات کو ایک کلمہ بنا لیتے ہیں۔ مثلاً ضاق قلبا: تنگ دل شد، یا ھو قاسی قلباً وے سخت دل ست'' (یعنی ضاق اور قلبا کا ترجمہ تنگ دل، یا قاسی اور قلباً کا ترجمہ سخت دل کر دیا گیا۔)

اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ عربی زبان میں تو مفعول بغیر حرفِ جر کے استعمال ہو جاتا ہے، مگر فارسی زبان میں حرفِ جر کا لانا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً فسیکفیکھم اللہ: کفایت خواہد کرد ترا اخدا از شرِ ایشاں''۔

اور بعض جملے ایسے ہوتے ہیں جن کے ترجمے میں زبان کے محاورات کے پیشِ نظر،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنی جانب سے تقدیم و تاخیر کو درست کرلیا جائے۔ مثلاً **قالوا اتخذ اللہ ولداً**: وگفتند فرزند گرفت خدا'' اور **اعطیت زیداً درھماً**: درہم دادم زیدرا۔ اور **کان زید قائماً**: ''بود زید قائم، یا بود زید قائم است''۔ اور **جعلت زیداً عبدی**: زید را بندۂ خود ساختیم'' (یعنی عربی کے یکساں جملوں کے ترجمے میں مختلف اسلوب کے ساتھ فعل و فاعل کی تقدیم و تاخیر کو اختیار کیا گیا ہے۔) ۱

اور کبھی وہ جملہ جس کو بہ تاملِ مصدر بنالیتے ہیں، ترجمے میں مصدر اور مفرد ہی بیان کیا جاتا ہے۔

اور مصدر مفرد کی تفسیر اس جملے کے ساتھ جو اس مصدر کو شروع میں لیے ہوئے ہو، نہیں کر سکتے۔ اور اس طرح موصول باصلہ اگر جملہ ہو تو اس کی تفسیر کلمۂ مفردہ کے ساتھ اور اگر کلمۂ مفردہ کی صورت میں ہو تو اس کی تفسیر جملے کی صورت میں نہیں کی جاسکتی۔ مثلاً 'وقال الذی آمن'' کا ترجمہ ''گفت آں مسلمان'' ہوگا۔ اور ''الذین آمنو'' کی تفسیر ''ایمان والو'' ہوگی۔ اور ''الذین اوتو الکتب'' کا ترجمہ ''اہلِ کتاب'' کریں گے۔ اور یہ اس صورت میں ہے کہ معنی واضح اور صاف ہوں۔

اور مثل **قد افلح المومنون الذین ھم فی صلاتھم خاشعون**: ہر آئینہ رستگار شدند آں مسلماناں کہ ایشاں در نماز خویش خشوع کنند'' میں ''الذین ھم'' ایسا ہے جیسا کہ آلذین آمنو، یعنی اگر موصول صفت اسمی واقع ہوا ہو تو اس پر لفظ ''آں'' کو مقدم کر کے اس کو موصوف بنادیا جائے گا۔ (جیسا کہ ''آں مسلماناں'' میں کہا گیا۔ اور معمول کو مقدم کر کے جب تخصیص کے معنی حاصل کیے جائیں، تو فارسی زبان میں اس تخصیص کی علامت بھی لفظ ''آں'' مقرر ہے۔

ع.بان زبان کی ضمائر کم، ھم، ھو، ایاہ کا ترجمہ بعض مواقع میں خود بخود تعبیر کرلیا جاتا ۲ ہے۔ اور فارسی زبان میں ان کو اس طرح کہہ سکتے ہیں ''شمار است گوئید''، ''ایشاں اندر است گوئے''۔ ان جیسے مواقع میں اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ یوں کہا جائے۔ ''ایشانند را است گویاں (یعنی 'ایشان'' کے بعد 'راست گویاں'' کو جمع لانا ضروری نہیں ہے۔)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اگر ایسا موقع ہے کہ وہاں مضمر لانا چاہیے، مگر اس جگہ مظہر لایا گیا، تو فارسی زبان میں اس مقام پر لفظ ''آں'' اضافہ کرنا چاہیے۔ تاکہ ربط باقی رہے اور جملہ غیر مربوط نہ ہونے پائے۔

فارسی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ خواہ فاعل مظہر (الفاظ میں ظاہر وموجود) ہو، فعل کے ساتھ علامت مفرد د جمع ضرور ملحق کرتے ہیں۔ مثلاً قام هولاء کا ترجمہ ''ایستادند ایشاں'' کیا جائے گا۔

''واؤ'' اور ''فا'' اکثر زائد ہوتے ہیں اور معنی نہیں رکھتے۔ اور فارسی زبان میں یہ طریقہ اکثر و بیشتر رائج ہے کہ عطف اور تعقیب کے ذکر کے بغیر ''واؤ'' اور ''فا'' کو ربط کے معنی میں استعمال کر لیتے ہیں۔ پس اگر اس صورت میں ترجمہ کے اندر رکاکتِ لفظی پیدا ہو جائے تو ''واؤ'' اور ''فا'' کا ترجمہ کر دینا چاہیے۔

الحاصل، فنِ ترجمہ کی باریکیاں بہت ہیں اور اس مقام پر ہمارا مقصود صرف نمونے کے طور پر چند باتیں بیان کر دینا ہے۔ **حسبنا الله و نعم الوكيل ولا حول ولا قوة الا بالله۔**

[اللہ کا شکر و احسان ہے کہ یہ متبرک رسالہ بخطِ عاصی پر معاصی محمد علی الحسینی القطبی، ۲۱ر جمادی الثانی ۱۲۲۷ء اختتام کو پہنچا۔ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِكَاتِبِهٖ (آمین!)]

© rasailojaraid.com